بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جماعت اسلامی کے کُل پاکستان اجتماع کے موقع پر لاہور میں جو کچھ ہوا وہ درحقیقت ہماری قومی زندگی کا ایک بڑا المناک سانحہ ہے۔ کرایہ پر لائے ہوئے چند غنڈوں نے، جن کو پہلے شراب پلائی جا چکی تھی، شریف انسانوں کے ایک پُرامن مجمع پر دن دہاڑے حملہ کیا، اور اپنی بدمستی میں یہاں تک بڑھ گئے کہ خواتین کے کیمپ پر اینٹیں اور بوتلیں پھینکیں، قرآن مجید کی جلدیں اٹھا اٹھا کر پتھروں اور اینٹوں کی طرح لوگوں کو ماریں، اور فائرنگ کر کے ایک بے گناہ انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کتنی المناک اور روح فرسا ہے یہ خبر اور کتنا بڑا گھاؤ ہے جو اسے سُن کر سینے میں پڑتا ہے۔

عقل کے جن اندھوں نے اس سارے شرمناک خونی ڈرامہ کی ہدایت کاری کا اہم فرض سرانجام دیا ہے، ممکن ہے اُن کے لیے یہ کوئی عظیم کارنامہ ہو اور اس مہم کو سر کرنے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہوں لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے فہم و بصیرت کی تھوڑی سی مقدار بھی دی ہے اور جن کی نظروں کو زینتِ حیاتِ دنیا کی عارضی چمک دمک نے بالکل خیرہ نہیں کر دیا ہے، ان کے لیے یہ حادثہ اپنے اندر فتح و کامرانی کا کوئی پہلو نہیں رکھتا بلکہ اخلاقی شکست کا کھلا ہوا اعلان ہے۔ یہ واقعہ اگر ایک طرف اس بات کا اظہار ہے کہ اہلِ غرض اپنے مفاد کی حفاظت کی فکر میں کہاں تک جا سکتے ہیں، تو دوسری طرف یہ اللہ کے قانونِ مکافات کو حرکت میں لانے کے لیے ایک دعوت بھی ہے۔ اگرچہ اغراض کے پیچھے اندھے ہو جانے والے لوگ اس بات کو ہمیشہ بھولے رہتے ہیں کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو ان کے کرتوتوں کو دیکھ رہا ہے اور اس کے ہاں کوئی قانونِ مکافات بھی ہے جس میں دیر تو ہوتی ہے مگر اندھیر کبھی نہیں ہوتا۔

یہ کچھ عجیب ہی سا معاملہ ہے کہ جماعت اسلامی کا یہ اجتماعِ عام ایک ایسے ماحول میں ہوا جس پر ابتدا ہی سے نحوست کے بادل منڈلانے شروع ہو گئے تھے۔ ذرا پلٹ کر گزرے ہوئے واقعات پر ایک نگاہ ڈالیے:

جولائی ۱۹۶۳ء کے آغاز میں مرکزی مجلسِ شوریٰ نے اس امر کا فیصلہ کیا کہ جماعت کا کُل پاکستان اجتماع ۲۵ سے ۲۸ اکتوبر تک لاہور میں منعقد ہوگا۔ اجتماع کے انتظامات کے لیے جو کمیٹی تشکیل کی گئی اُس نے طے کیا کہ اجتماع کے لیے موزوں جگہ اقبال پارک (منٹو پارک) ہے۔ چنانچہ ۲۰ جولائی کو ناظمِ اجتماع نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کو اس مضمون کی درخواست دی کہ ۱۶ اکتوبر سے ۳۱ اکتوبر تک کے لیے اس پارک کو ہمارے لیے مختص کر دیا جائے اور ہمیں اس عرصہ میں اسے استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب نے ناظمِ باغات کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا جنہوں نے معاملہ کو ہوم سکرٹری کی طرف منتقل کر دیا۔ اس کے بعد ناظمِ اجتماع نے ہوم سکرٹری صاحب کے دفتر کے طواف شروع کیے اور انہوں نے حکم صادر کرنے میں جس دفتری لیت و لعل سے کام لیکر اس معاملہ کو معرضِ التوا میں ڈالا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ حالات کسی اچھے رُخ کی طرف نہیں جا رہے ہیں۔ بالآخر تنگ آکر ۲ اکتوبر ۶۳ء کو قیم جماعت اسلامی پاکستان میاں طفیل محمد صاحب نے گورنر مغربی پاکستان کو اور ناظمِ اجتماع نے ہوم سکرٹری صاحب کو توجہ دلائی کہ اجتماع کے انتظامات کے لیے ہمیں کم از کم تین ہفتہ پہلے اجازت ملنی ضروری ہے۔ لہٰذا اگر ۵ اکتوبر تک ہمیں اجازت نہ دی گئی تو ہم عوام کے سامنے یہ اعلان کرنے میں حق بجانب ہونگے کہ حکومتِ مغربی پاکستان نے ہمیں اجتماع کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس پر آخر کار اقبال پارک کی کھلی جگہ کو چھوڑ کر آبادی کے درمیان شاہراہ عام پر وہ تنگ میدان جماعت کو دیا گیا جو بھاٹی دروازے اور ٹکسالی کے درمیان واقع ہے۔

اس مسلسل تعویق اور لیت و لعل سے اجتماع کے منتظمین کو انتظام میں جس قسم کی عملی دشواریاں پیش آئیں اور اس میں شریک ہونے والے احباب کو جس قسم کے ذہنی اضطراب سے گزرنا پڑا اس کا کچھ اندازہ وہی لوگ

کر سکتے ہیں جنہیں اس صورتِ حال سے کبھی سابقہ پیش آیا ہو۔ ایک طرف ملک کے گوشے گوشے سے پابرکاب لوگ تذبذب میں گرفتار ہو کر بار بار اجتماع کے بارے میں استفسار کر رہے تھے، دوسری طرف منتظمین بیچارے یقین کے ساتھ کوئی جواب دینے سے قاصر تھے۔ تذبذب اور بے یقینی کی اس فضا میں جماعت کے کارکنوں پر جو گزری اور انہیں جس قسم کے نقصانات برداشت کرنے پڑے وہ تو ایک الگ داستان ہے۔ لیکن اس معاملہ کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس مسلسل "آنکھ مچولی" کے بعد اجتماع کے لیے جو جگہ عطا کی گئی وہ اس کام کے لیے کسی اعتبار سے موزوں نہ تھی۔ مقام کی یہ تبدیلی کن مصالح کی بنا پر کی گئی، اس کو تو وہی ذات جانتی ہے جو عالم الغیب والشہادہ اور علیم بذات الصدور ہے۔ مگر بعد کے واقعات اس فیصلے کی صحت کے بارے میں کوئی نیک گمان قائم کرنے کی گنجائش نہیں چھوڑتے۔

اس کے بعد لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی اجازت کا مرحلہ پیش آیا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ ملک کی ایک مسلّم جماعت جو ۲۲ سال سے کام کر رہی ہے، اپنا کُل پاکستان اجتماع منعقد کرتی ہے، لیکن اُسے لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان سے بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہو سکتی کہ اتنے بڑے اجتماع کی کارروائی لاؤڈ اسپیکر کے بغیر ہونی محال ہے اور اس سے محروم کرنے کے معنی عملاً اجتماع کو روکنے کے ہیں۔ جماعت اسلامی کی طرف سے جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اس حکم کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا تو حکومت نے عدالت کا فیصلہ صادر ہونے سے پہلے فوراً ایک آرڈیننس نافذ کر دیا۔ اس ایک واقعہ سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں انتظامیہ کو آرڈی ننسوں کے ذریعہ سے قانون سازی کے بغیر معمولی اختیارات دیئے گئے ہیں وہ کس طرح استعمال کیے جاتے ہیں۔

ان سب موانع کے باوجود جب اجتماع منعقد کرنے کا فیصلہ ہی کر لیا گیا تو اجتماع سے دو تین روز پہلے مرکزی اور صوبائی وزراء نے یکایک جماعت اور اس کے امیر کے خلاف بیانات کی ایک

مہم شروع کر دی۔ یوں نظر آتا ہے کہ ۲۳ اکتوبر کو اچانک ان پر یہ راز منکشف ہو گیا تھا کہ یہ جماعت اور اس کا قائد ملک و ملت کے دشمن ہیں، اس لیے فوراً انہوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ اجتماع سے پہلے پہلے عوام کو اس سے خبردار کریں تاکہ ملک کو کوئی نقصانِ عظیم نہ پہنچ جائے۔ حالانکہ نہ جماعت اسلامی کوئی نئی جماعت تھی اور نہ اس کا امیر یکایک کہیں خلا میں سے زمین پر آن اترا تھا۔ امیر جماعت کو اس برِعظیم میں کام کرتے ہوئے چالیس سال گزر چکے ہیں اور اس مدت میں ان کے لکھے ہوئے ہزاروں صفحات لاکھوں آدمیوں نے پڑھے ہیں اور ملک کے ہزارہا گھروں میں ان کی کتابیں موجود ہیں۔ اسی طرح جماعت اسلامی ۲۲ سال سے اس برِعظیم میں کام کر رہی ہے۔ اور اس کا عیب و صواب جو کچھ بھی ہے سارے ملک پر عیاں ہے۔ جماعت کی ہیئت، اس کا طریقِ کار، اس کا دستور، اس کا منشور، اس کی قراردادیں اور اس کی آج تک کی تاریخ، غرض کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جو معلومِ عوام نہ ہو اور پہلی مرتبہ ہی ان حضرات پر منکشف ہو گئی ہو۔ اب یہ بات بالکل ناقابلِ فہم ہے کہ اجتماع سے دو تین روز پہلے آخر کیا نئی بات ایسی پیش آگئی تھی جسے طشت از بام کرنے کے لیے ان وزراء کو ایک تازہ مہم چلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پھر اس تازہ مہم میں بھی انہوں نے کوئی نیا انکشاف نہیں کیا بلکہ پندرہ پندرہ اور بیس بیس سال پرانی باتیں ہی دُہرانی شروع کر دیں، گویا کہ یہ اب ان کے علم میں آئی ہیں۔

اس کے بعد اجتماع میں جس شرمناک کھیل کا مظاہرہ ہوا، اس پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے اُسی قدر کم ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شیطنت، تہذیب و شائستگی کے سارے پردے اتار کر اب ننگا ناچ ناچنے میں منہمک ہے۔ ایک طرف تہذیب و شرافت تھی اور دوسری طرف گندی گالیاں۔ ایک جانب مظلومانہ مدافعت تھی اور دوسری جانب دراز دستیاں۔ ایک طرف صبر و وقار تھا اور دوسری طرف نہایت ذلیل قسم کی غنڈہ گردی۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کے محافظوں کے سامنے کھلے بندوں ہو رہا تھا اور وہ اسے بالکل تماشائیوں کی طرح دیکھ رہے تھے۔ ان کے اس طرزِ عمل کا مشاہدہ دو چار آدمیوں نے نہیں ہزاروں حاضرین نے

کیا ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ غنڈے بیس پچیس سے زیادہ نہ تھے۔ شہر کے جانے پہچانے بدمعاش تھے جن سے پولیس کا ناواقف ہونا ممکن نہیں ہے۔ اجتماع میں کوئی ہڑبونگ نہ تھی کہ غنڈے اس میں چھپ جاتے۔ ساری اجتماع گاہ میں وہی چند آدمی کودتے پھر رہے تھے اور علانیہ سب سے الگ نظر آرہے تھے۔ اور انہی میں سے ایک نے پولیس کی آنکھوں کے سامنے ایک بے گناہ کارکن کو قتل کیا۔ لیکن امن کے کسی محافظ نے ان غنڈوں کو گرفتار نہ کیا۔ اور آج اُن کو یہ تحقیق کرنے میں بھی مشکل پیش آرہی ہے کہ قاتل کون تھا۔

یہاں انسان کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ جنہوں نے یہ غنڈہ گردی کی ہے، انہیں ایک دینی یا سیاسی جماعت کے جلسے سے بذاتِ خود کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ جن لوگوں کا شیوہ مسافروں کی گرہیں کاٹنا ہے، سینماؤں کے ٹکٹوں کی بلیک کرنا ہے، جُوا کھیلنا ہے، انہیں آخر کونسی جاذبیت جماعت اسلامی کے "غیر دلچسپ" اجتماع میں کھینچ کر لے آئی۔ ایک ایسا اجتماع جس میں کسی قوالی یا ریکارڈنگ کا انتظام موجود نہ ہو۔ جس میں کسی لچھے دار تقریر کی بھی گنجائش نہ ہو۔ حتیٰ کہ جس میں لاؤڈ سپیکر بھی موجود نہ ہو، اس میں ان "اصحابِ ذوق" کی تشریف آوری کیسے ہوئی۔ یہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ یہ لوگ تو اس قسم کی بے کیف مجالس کے سایے سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ مگر یہاں اُن کا یہ حال تھا کہ وہ ایک گروہ کی صورت میں اُمڈے چلے آرہے تھے۔

یہ واقعہ محض اس بنا پر کسی کے لیے خوش آئند نہیں ہونا چاہیے کہ یہ جماعت اسلامی کے ساتھ پیش آیا ہے جس سے کچھ لوگ ناراض ہیں۔ درحقیقت یہ ہماری قومی زندگی کے لیے ایک خطرہ ہے جسے اگر پرورش پانے دیا گیا تو ہمارے قومی معاملات سنجیدہ بحث و کلام اور آئینی طریقِ کار سے طے ہونے کے بجائے دنگے اور فساد سے طے ہونے لگیں گے اور شریف و معقول آدمیوں کے لیے یہاں کام کرنا ممکن نہ رہے گا۔

یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد توقع تھی کہ اربابِ اختیار سنجیدگی کے ساتھ سارے معاملے پر پھر غور کریں گے اور کم از کم اب تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کسی حزبِ اختلاف کے اصول، مقصد اور کام کو خواہ وہ کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں، مگر انہیں معقول جمہوری طریقوں ہی سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اس کے خلاف نفرت پھیلانے سے باز رہنا چاہیے لیکن افسوس ہے کہ یہ توقع بھی پوری نہ ہوئی بلکہ نفرت انگیزی کی مہم پہلے سے زیادہ زور شور کے ساتھ چل رہی ہے اور جماعت اور امیرِ جماعت پر ایک سے ایک بڑھ کر گھناؤنے الزامات بے تحاشا لگائے جا رہے ہیں۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اتنے وسیع و عریض ملک پر اختیار و اقتدار بخشا ہے اور جنہیں کروڑوں بندگانِ خدا کی عزت و آبرو اور جان و مال کا امین بنایا گیا ہے، اُن کے ظرف میں بھی کافی وسعت ہونی چاہیے جو لوگ ذرا ذرا سے اختلاف پر مشتعل ہو کر آپے سے باہر ہو جاتے ہوں، اور اختلاف کرنے والوں سے وہ سلوک شروع کر دیتے ہوں جس کا مظاہرہ ہم جماعت اسلامی کے معاملے میں دیکھ رہے ہیں، ان کے فہم و تدبر کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ حکومت و فرمانروائی بشرطیکہ اس کا مقصد فی الواقع اہلِ ملک ہی کی خدمت ہو، بڑی نازک ذمہ داری ہے اور اس سے وہی لوگ بطریقِ احسن عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو صرف مدح و توصیف سننے کے آرزومند نہ ہوں بلکہ تنقید کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہوں۔ جو حضرات ملک کی زمامِ کار اس مفروضہ کے ساتھ سنبھالتے ہیں کہ ملک کی پوری آبادی اپنے ذہن، شعور، احساس اور ضمیر کو برسرِ اقتدار طبقہ کے ہاتھ میں گروی رکھ کر، اس سے اپنی وفاداری استوار کرے گی۔ وہ خود اپنے لیے اور پوری قوم کے لیے بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ تنقید کا ہر حرف لازمی طور پر فسادِ نیت ہی کا نتیجہ نہیں ہوتا اور اختلاف کی ہر آواز ہمیشہ حسد کی آگ میں جلتے ہوئے ہی بلند نہیں کی جاتی۔ اختلاف نیک نیتی سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور قوم میں کوئی گروہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو ایمانداری کے ساتھ کچھ باتوں کو غلط سمجھ کر ان کی اصلاح کے لیے کوشاں ہو۔ اس بنا پر یہ سمجھ لینا کہ اتنے بڑے ملک میں جو شخص یا گروہ بھی اقتدار کے نقطۂ نظر سے سو فیصدی متفق نہیں ہوتا وہ لازمی طور پر ملک و ملت کا دشمن ہی ہے بہت

بڑی غلطی ہے اور اس کا جس قدر جلدی ازالہ کر لیا جائے اتنا ہی ملک اور حکمراں طبقے دونوں کے لیے بہتر ہے۔ جماعت اسلامی ۱۶ سال سے پاکستان میں کام کر رہی ہے اور ان ۱۶ برسوں میں یہاں کیا کچھ نہیں ہو چکا ہے۔ مگر کوئی شخص ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کر سکتا کہ اس جماعت نے کبھی کسی سے سودے بازی کی ہو، یا اس کے کسی آدمی نے کسی عہدہ و منصب کے لیے دوڑ دھوپ کی ہو، یا اس کا کوئی رکن اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتا نظر آیا ہو جس میں دوسرے لوگ غوطے لگا رہے تھے کیا کسی صاحبِ ضمیر آدمی کے لیے جماعت کی یہ تاریخ اس بات کا یقین دلانے کو کافی نہیں ہے کہ اس کا اختلاف اغراض پر نہیں بلکہ ایمانداری پر مبنی ہے؛

دنیا میں جہاں کہیں بھی برسرِ اقتدار طبقہ حزبِ اختلاف سے نمٹنے کے لیے اوچھے ہتھیاروں پر اتر آتا ہے اس سے لوگوں کو اس امر کا یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا موقف اخلاقی اعتبار سے کمزور ہے۔ یہ طریقہ اقتدار کو مضبوط کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ اس کو ضعف پہنچانے کا موجب ہوتا ہے۔ اقتدار کے لیے مضبوط ترین بنیاد اگر کوئی ہے تو وہ یہ کہ لوگوں کو اس کے موقف کی صحت کا اطمینان ہو۔ اس اطمینان کو منزل کر دینے کے بعد اہلِ اقتدار مجبور ہو جاتے ہیں کہ انتظامیہ کی طاقت پر انحصار کریں اور دلوں پر حکومت کرنے کے بجائے صرف جسموں کو تابع بنا کر رکھیں۔

ہمارے ملک میں جو چیز آج تک جمہوریت کے صحیح نشوونما میں حائل رہی ہے وہ اصحابِ اقتدار کی یہی غیر دانشمندانہ روش ہے۔ جب بھی کوئی گروہ برسرِ اقتدار آیا اور اس نے اپنے ناعاقبت اندیشانہ طرزِ عمل کی وجہ سے عوام میں اپنی مقبولیت کھونا شروع کی تو اس نے اپنی روش میں اصلاح کرنے کی بجائے انتظامیہ کو براہِ راست اپنی امداد پر اُبھارا اور اس کی طاقت کو اپنے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس طریقِ کار سے برسرِ اقتدار طبقوں کو جو فائدہ حاصل ہوا وہ تو الگ بحث ہے، جس میں ہم اس وقت پڑنا نہیں چاہتے۔ البتہ ایک چیز بالکل واضح ہے کہ اس قسم کی غلط تدبیروں سے آج انتظامیہ ملک کی خادمہ بننے کی بجائے اس کی غیر مسئول قوتِ حاکمہ بن گئی ہے۔ یہ طبقہ جس طرح

چاہتا ہے من مانی کارروائیاں کرتا ہے، اس کے ہاتھوں لوگوں کے ساتھ طرح طرح کی بے انصافیاں ہو رہی ہیں، اور حکومت کے جو فیصلے بھی اس نوکر شاہی طبقہ کے مزاج اور مفاد کے خلاف ہوتے ہیں، وہ نافذ نہیں ہونے پاتے۔ ایسے ہی حالات ہوتے ہیں جن میں عوام یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اُن کی رائے اُن کے اپنے ملک میں قطعاً کوئی وزن نہیں رکھتی بلکہ اصل قدر انہی لوگوں کی ہے جو حکومت کی انتظامی مشنری پر کسی نہ کسی حیثیت سے قابض ہو گئے ہیں۔ اس سے لوگوں کے اندر افسردگی اور ملکی معاملات سے عدم دلچسپی پیدا ہو جانا ایک فطری بات ہے اور یہ عوارض قومی زندگی کو کھوکھلا کر کے رکھ دیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں نوکر شاہی کے بڑھے ہوئے حوصلے ایک اور وجہ سے بھی انتہائی تشویشناک ہیں۔ اس خطہ پر ۱۶ برس پیشتر ایک ایسی قوم حکومت کر رہی تھی جو افکار و نظریات، احساسات و جذبات اور اطوار و عادات کے اعتبار سے ہم سے بالکل مختلف تھی۔ اس قوم کو ہم سے بجز اس کے اور کوئی دلچسپی نہ تھی کہ ہم اس کے کارخانوں کے لیے خام مال مہیا کریں اور پھر جو مال وہاں تیار ہو اس کی کئی گنی قیمت ادا کر کے اسے دنیاوی اعتبار سے فارغ البال کر دیں۔ اس بنا پر یہ قوم ہمیں انسان سمجھ کر ہم سے انسانوں جیسا برتاؤ نہ کرتی تھی بلکہ ہمیں جانوروں سے بھی بدتر مخلوق خیال کر کے ہم سے بڑا ظالمانہ سلوک روا رکھتی تھی۔ پھر وہ اس حقیقت کو بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس ملک پر قبضہ کرنے اور اس کی دولت کو اندھا دھند لوٹنے کے لیے اس کے پاس کوئی جواز نہیں، اس لیے وہ ڈاکوؤں کی سی ذہنیت کے ساتھ صرف تشدد کے ذریعہ اپنے کام نکالتی تھی۔ اسے یہ معلوم تھا کہ جب بھی اہلِ ملک کا شعور بیدار ہوگا، اسے اس خطے کو خیرباد کہنا ہوگا۔ اس بنا پر اسے اس بات کی فکر دامنگیر رہتی تھی کہ کسی طرح لوگوں کے اندر بیداری نہ پیدا ہونے پائے۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے اُس نے وہ سارے شرمناک حربے استعمال کیے جو استعمار پسند قومیں عام طور پر کرتی ہیں۔ اس نے سب سے پہلے اس امر کا التزام کیا کہ انتظامیہ

کو زیادہ سے زیادہ اختیارات سونپے جائیں تاکہ اس کی مدد سے مخالفین کو اچھی طرح دبایا جاسکے اور اسے عوام کی گردنوں پر اس طرح مسلط کر دیا جائے کہ وہ بھیڑوں کا ایک گلہ بن جائیں جنہیں اقتدار کی لاٹھی جس طرف چاہے میکانکی طور پر ہانک کر لے جائے۔

اس "کارِ خیر" کو کامیابی کے ساتھ سرانجام دینے کے لیے انتظامیہ کو خاص تربیت دی گئی اور انہیں قومی و ملی احساسات سے بیگانہ کیا گیا تاکہ کسی آزمائش کے وقت اُن کے ہاتھوں میں کوئی لرزش نہ پیدا ہونے پائے اور وہ بے حس مشینوں کی طرح اپنی ہی قوم کو دبانے کی خدمت انجام دینے پر ہر وقت آمادہ رہیں۔

اسے ہماری بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ہماری انتظامیہ کو انگریز کی تربیت یافتہ انتظامیہ سے ترکہ میں بہت سی روایات ملی ہیں۔ اس کے اندر درشتی، تکبّر اور نخوت کے جذبات کی وہی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جن کے مظاہرے ہم انگریزی عہد میں بالعموم دیکھتے تھے۔ عوامی احساسات سے اس کے تغافل میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوا۔ اس صورتِ حال میں عوام اگر مایوس نہ ہوں تو اور کیا کریں۔ برسرِ اقتدار طبقے بیشک یہ پروپیگنڈا کرتے رہیں کہ مایوسی کی یہ لہر کسی "اقتدار کی خواہاں" جماعت نے دوڑائی ہے۔ لیکن عوام اصل حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں۔ ان بچاروں کو جن ٹھوس واقعات اور تلخ حقائق سے دن رات سابقہ پیش آتا ہے وہ اس سے آخر کس طرح صرفِ نظر کر سکتے ہیں۔ وہ انتظامیہ کے ہاتھ میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہے ہیں اور ان کے اندر یہ حوصلہ شکن احساس روز بروز بڑھ رہا ہے کہ ملک کے معاملات کا فیصلہ اب اُن کے ہاتھ میں نہیں رہا بلکہ ایک ایسے مختصر سے طبقہ کے ہاتھ میں ہے جو ان کے احساسات و جذبات سے یکسر بیگانہ اور اُن کے دل کی دھڑکنوں کو سمجھنے سے عاجز ہے

جماعت اسلامی اور اس کے امیر کے خلاف پروپیگنڈے کا جو خوفناک طوفان اس وقت اٹھایا جا رہا ہے وہ افسوسناک ہونے کے علاوہ بڑا عبرتناک بھی ہے۔ اسے دیکھ کر انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ چڑ

اور ضد کے جذبات میں بہک کر لوگ کس سطح تک اُتر جاتے ہیں اور غیظ و غضب ان کے دماغی توازن کو کس حد تک بگاڑ دیتا ہے۔ پراپیگنڈے کی اس مہم میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی طرف بعض ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جن سے ان کا دامن ہمیشہ پاک رہا ہے بلکہ انہوں نے انہیں مٹانے کے لیے سر توڑ کوشش کی ہے۔ ان کی تحریروں کا ایک ایک حرف اور اُن کی تقریروں کا ہر لفظ بلکہ اُن کی زندگی کا ہر لمحہ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ انہیں ان چیزوں سے کتنی نفرت ہے اور وہ ملک و قوم کے لیے انہیں کتنا نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ ان چیزوں میں شاید سرفہرست "طاقت کے ذریعہ اقتدار کی تبدیلی ہے"۔ وزیر داخلہ صاحب نے الزام لگایا ہے کہ مولانا قوت کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ شخص جس نے مولانا کی تحریروں کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے یا جو اُن کے طرزِ فکر سے بالکل سرسری واقفیت بھی رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ چیز مولانا کے مزاج سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ انہوں نے سیاسی تبدیلی کے لیے قوت و طاقت کے استعمال کی ہمیشہ مذمّت کی ہے اور لوگوں کو اس بات کا قائل کیا ہے کہ اس قسم کی مصنوعی تبدیلیوں سے ملک کے اندر کوئی خوشگوار انقلاب نہیں آسکتا۔ اسے زمانے کی ستم ظریفی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ قوت کے ذریعہ سے برسرِ اقتدار آنے والے لوگ ہی اب اُلٹا مولانا پر یہ الزام لگانے کی جسارت کر رہے ہیں۔

نوابزادہ لیاقت علی خاں کے قتل پر مولانا محترم نے جن احساسات کا اظہار فرمایا تھا اس میں انہوں نے اس رجحان کی بڑی سختی سے مخالفت کی اور بتایا کہ اگر کوئی قوم عقل و فکر سے یکسر عاری نہیں ہو چکی تو وہ سیاسی تبدیلی کے لیے قوت کبھی استعمال نہیں کرتی۔ اسی موضوع پر وہ بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ واقعہ اس لحاظ سے خطرناک بھی ہے کہ یہ اس ملک میں ایک بہت بُرے رجحان کے اُبھرنے کی علامت ہے۔ اگرچہ سرِدست یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس حرکت کا محرک کیا تھا۔ کوئی جماعت محرک تھا یا شخصی۔ لیکن اگر فی الواقع وہ کوئی سیاسی محرک تھا تو یقیناً یہ حالات کو ایک ایسے رُخ کی طرف موڑنے والی حرکت ہے جس کی ہر اُس شخص کو مذمّت کرنی چاہیے جو اِس ملک اور اِس

ملت کی فلاح چاہتا ہو۔ کسی ملک کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی بدقسمتی نہیں ہو سکتی کہ اس میں فیصلے کا آخری اختیار عقل، شعور، دلیل اور رائے عامہ سے چھین کر قاضی شمشیر کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ قاضی کوئی عادل اور صاحبِ فکر قاضی نہیں ہے۔ یہ اندھا، بہرا اور گونگا قاضی ہے۔ اس سے جب کبھی فیصلہ چاہا گیا ہے، اُس نے حق اور انصاف دیکھ کر نہیں بلکہ خون کی رشوت لیکر فیصلہ کیا ہے، اور جس نے بھی زیادہ خون چٹا دیا ہے اُسی کے حق میں اُس نے فیصلہ دے دیا ہے، خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر، خواہ وہ نیک ہو یا بد۔ کوئی قوم جو خود اپنی دشمن نہ ہو اور جس کی عقل کا دیوالہ نہ نکل چکا ہو، ایسی بیوقوف نہیں ہو سکتی کہ اپنے معاملات کا فیصلہ شعور و استدلال کے بجائے تلوار کے اندھے اور رشوت خوار قاضی کے حوالہ کر دے۔ اگر ہم اپنا مستقبل تاریک نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں پوری طاقت کے ساتھ اپنے ملک کے حالات کو اس خطرناک رُخ پر جانے سے روکنا چاہیے۔"

(ہمارے داخلی اور خارجی مسائل، مطبوعہ ۱۹۵۱ء، ص۴)

اسی سلسلہ میں جماعت اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کی ایک قرارداد بھی ملاحظہ فرمائیں جو اس نے ستمبر ۱۹۴۸ء میں طریقِ کار متعیّن کرتے ہوئے پاس کی تھی:

"اپنے اس مقصد کے لیے یہ جماعت ایسے ذرائع اور طریقوں کا استعمال جائز نہیں سمجھتی جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں، یا جن سے بدنظمی اور بدامنی رونما ہو۔ وہ اصلاح و انقلاب کے لیے جمہوری طریقوں پر یقین رکھتی ہے، یعنی تبلیغ و تلقین کے ذریعے سے اذہان اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے اور رائے عام کو ان تغیّرات کے لیے ہموار کیا جائے جو ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ جماعت کا کوئی کام خفیہ نہیں ہے بلکہ سب کچھ علانیہ ہے۔ جن قوانین پر ملک کا نظم و نسق اس وقت چل رہا ہے ان کو وہ توڑنا نہیں چاہتی بلکہ اسلامی اصولوں کے مطابق بدلنا چاہتی ہے۔ جو لوگ ملک کا نظم و نسق چلا رہے ہیں

انہیں ہٹانا یا خود ان کی جگہ لینا اس کے پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ وہ انہیں ہم خیال بنانا چاہتی ہے اور اگر وہ اصلاح قبول نہ کریں تو پھر جمہوری طریقوں پر انہیں ایسے لوگوں سے بدلنا چاہتی ہے جو اصلاح یافتہ رائے عام کے نزدیک صالح ہوں۔"

انہی اصولوں کو اُس دستور میں شامل کیا گیا جو ۱۹۵۲ء میں جماعت اسلامی کی مجلسِ دستور ساز نے مرتب کیا تھا، اور یہ اصول جُوں کے توں اس ترمیم شدہ دستور میں بھی موجود ہیں جو ۱۹۵۶ء میں بنایا گیا تھا اور جس پر اس وقت جماعت کام کر رہی ہے (ملاحظہ ہو دستور جماعت ۱۹۵۲ء، دفعہ ۱۰۔ اور دستور جماعت ۱۹۵۶ء، دفعہ ۵)

محولۂ بالا تصریحات کو بار بار پڑھیے اور پھر خود اندازہ لگائیے کہ جو لوگ مولانا اور جماعت اسلامی پر سیاسی تبدیلی کے لیے قوت و طاقت کے استعمال کا الزام لگا رہے ہیں وہ اپنے پاس حق پرستی اور انصاف پسندی کا کتنا سرمایہ رکھتے ہیں۔ پھر یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ ان اقتباسات میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے انہیں تحریکِ اسلامی کے وسیع لٹریچر کے کسی مستور گوشے سے اٹھا کر وقتی ضرورت کے پیشِ نظر اجاگر نہیں کیا گیا ہے۔ یہ وہ عام خیالات ہیں جن کی جھلکیاں اس کے پُورے ادب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ آئینی و جمہوری ذرائع کے استعمال سے تبدیلی کی امنگ جماعت کے مزاج کا ایک نہایت ضروری حصّہ ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔

جماعت اسلامی تو اپنے ہی ملک میں نہیں بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی کام کرنے والے نوجوانوں کو مسلسل یہ تلقین کر رہی ہے کہ وہ مسلح انقلاب اور زیرِ زمین تحریکوں کو چھوڑ کر کھلے بندوں آئینی و جمہوری طریقوں سے اصلاحِ احوال کی جدوجہد کریں۔ چنانچہ گذشتہ حج کے موقع پر اسلامی ممالک کے نوجوانوں کے ایک اجتماع میں امیرِ جماعت نے جو تقریر کی وہ اُن کے طرزِ فکر کی پُوری طرح ترجمانی کرتی ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"اسلامی تحریک کے کارکنوں کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ انہیں خفیہ تحریکیں چلانے اور

اسلحہ کے ذریعہ سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی دراصل بے صبری اور جلد بازی ہی کی ایک صورت ہے اور نتائج کے اعتبار سے دوسری صورتوں کی بہ نسبت زیادہ خراب ہے۔ ایک صحیح انقلاب ہمیشہ عوامی تحریک ہی کے ذریعہ سے برپا ہوتا ہے۔ کھلے بندوں عام دعوت پھیلائیے۔ بڑے پیمانہ پر اذہان اور افکار کی اصلاح کیجیے۔ لوگوں کے خیالات بدلیے۔ اخلاق کے ہتھیاروں سے دلوں کو مسخر کیجیے۔ اور اس کوشش میں جو خطرات اور مصائب بھی پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کیجیے۔ اس طرح بتدریج جو انقلاب برپا ہوگا وہ ایسا پائیدار اور مستحکم ہوگا جسے مخالف طاقتوں کے ہوائی طوفان محو نہ کر سکیں گے۔ جلد بازی سے کام لیکر مصنوعی طریقوں سے اگر کوئی انقلاب دو نما ہو بھی جائے تو جس راستے سے وہ آئے گا اسی راستے سے وہ مٹایا بھی جا سکے گا۔"

(ترجمان القرآن ماہ جون ۱۹۶۳ء جلد ۶۰ عدد ۱)

اس سلسلہ میں یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مولانا محترم کی جن تحریروں سے آج یہ نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے کہ وہ سیاسی تبدیلی کے لیے طاقت استعمال کرنے کے قائل ہیں اُن میں سے کوئی تحریر بھی نئی نہیں ہے۔ الجہاد فی الاسلام پہلی بار ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی، اور اب تک اس کے چار ایڈیشن کئی ہزار کی تعداد میں نکل چکے ہیں۔ اسی طرح خطبات جس کے آخری دو خطبے جہاد پر ہیں، ۱۹۳۸ء کی لکھی ہوئی کتاب ہے اور اب تک اس کے اتنے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں کہ اس کتاب کی اگر مجموعی اشاعت کا اندازہ لگایا جائے تو وہ کسی طرح بھی ایک لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ پھر اس کے آخری دونوں خطبے "حقیقتِ جہاد" کے نام سے بھی الگ شائع ہوئے ہیں، اور اس پمفلٹ کی اشاعت بھی ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق مولانا کی یہ دونوں کتابیں اس وقت کم از کم دو لاکھ گھروں میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ان خطبات کو ملک کے ہزاروں مساجد میں پورے التزام کے ساتھ سنایا گیا ہے اور لاکھوں افراد نے انہیں سنا ہے۔ انسانوں کی اتنی کثیر تعداد میں آج تک کسی ایک کے ذہن رسا نے بھی ان سے وہ معانی اخذ

نہیں کیے جو آج وزیرِ داخلہ صاحب اخذ کر رہے ہیں۔ ان کا یہ مطلب اب تک صرف دو گروہوں نے اخذ کیا ہے۔ ایک قادیانی، دوسرے منکرینِ حدیث۔ اس پر الفضل اور طلوعِ اسلام کے صفحات شاہد ہیں۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں گروہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی عداوت میں کس قدر اندھے ہو چکے ہیں اور اس عداوت کی اصل وجہ کیا ہے۔ وزیر صاحب کو زبان کھولنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے تھا کہ مولانا محترم کی یہ تحریریں کہیں انبار خانوں میں دبی ہوئی تو نہیں ہیں۔ یہ بے شمار لوگوں کے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ وہ جب اپنے ملک کی ایک ذمہ دار شخصیت کی زبان سے ایسی باتیں سنیں گے تو ان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

ہم اس ملک کے پڑھے لکھے اور سنجیدہ طبقہ کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ براہِ کرم الجہاد فی الاسلام کے دو ابواب یعنی بابِ سوم "مصلحانہ جنگ" اور بابِ چہارم "اشاعتِ اسلام اور تلوار"، اور اسی طرح "خطبات" کے آخری دو خطبے "جہاد" اور "جہاد کی اہمیت" کا خود غیر جانبداری سے مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ کیا واقعی ان سے وہی نتائج نکلتے ہیں جن کی طرف وزیر صاحب بار بار اشارہ کر رہے ہیں۔

ہم یہ بات کسی فخر و مباہات کے جذبے سے نہیں بلکہ محض تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ ہم نے آج تک کبھی بھی کوئی فیصلہ اپنے ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر نہیں کیا بلکہ ہر قدم خدا اور رسول کے احکام کے تحت اسلام اور امتِ مسلمہ کے مجموعی مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر اٹھایا ہے۔ تقسیمِ ملک کی جدوجہد کے معاملہ میں ہم نے جو رویہ اختیار کیا تھا اُس میں بھی ہمارے سامنے صرف امت کی بھلائی ہی تھی۔ اس میں کوئی ذاتی غرض شامل نہ تھی۔ ہمارے اس رویّے کو سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل امور کو نگاہ میں رکھنا چاہیے:

—— سیاسی کشمکش حصہ سوم کے مضامین جن کا حوالہ آج دیا جا رہا ہے، ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں لکھے گئے تھے جبکہ ابھی یہ مسئلہ حل طلب تھا کہ ہندوستان (قبل تقسیم) کے متحدہ ہندوستان، میں اسلام

اور مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کی کیا صورت ہے۔ اس کتاب کے مصنف کی نگاہ میں اس کی جو صحیح ترین اور مناسب ترین صورت تھی اُسے انہوں نے دلائل کے ساتھ پیش کیا، اور یہ بتایا کہ دوسری جو صورتیں تجویز کی جا رہی ہیں ان میں کیا قباحتیں ہیں اور ان کے کیا نتائج ہونگے۔

——— مسلم لیگ نے جب ۱۹۴۰ء میں اپنا مشہور ریزولیشن پاس کیا جس میں پاکستان کو مسلمانوں کا قومی نصب العین قرار دیا گیا تھا، اس وقت کسی سے بھی یہ امر پوشیدہ نہ تھا، اور بہت سے دردمند مسلمان رہنما اسے محسوس کر رہے تھے کہ یہ صرف آدھی قوم کے مسئلے کا حل ہے۔ بقیہ آدھی قوم جو ہندوستان کے بڑے حصے میں ایک کمزور اقلیت کی حیثیت سے منتشر ہے وہ اسی تنگ دل اور متعصب اکثریت کے رحم و کرم پر رہ جائے گی جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ بلکہ الگ وطن بن جانے کے بعد اس کی حالت اور بھی زیادہ خراب ہو جائے گی۔

——— برطانوی ہند کے سیاسی حالات ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان جس نہج پر جا رہے تھے انہوں نے یہاں کافی حد تک بے یقینی کی فضا قائم کر رکھی تھی۔ انگریز آخری وقت تک تقسیم ملک سے انکار کرتا رہا اور پوری مسلم قوم کے ساتھ "آنکھ مچولی" کھیلتا رہا۔ اِدھر مسلم قوم کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی اُن میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنہیں صرف مفادات نے مسلم لیگ سے وابستہ کر دیا تھا۔ قائداعظم پر ان لوگوں کے خلوص کی حقیقت پوری طرح واضح تھی، اس لیے وہ کوئی سخت قدم اٹھانے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے اور اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا کوئی معقول حل اگر تقسیم ملک علاوہ بھی سامنے آجائے تو اُسے مان لیا جائے۔ غالباً اسی جذبہ کے تحت انہوں نے کیبنٹ مشن پلان کو قبول کرنا گوارا کیا۔ اگر کانگرس اس معاملے میں بدعہدی نہ کرتی تو آج حالات بالکل مختلف ہوتے۔

——— اس کے علاوہ کسی چشم بینا سے یہ حقیقت بھی اوجھل نہ تھی کہ پاکستانی تحریک جس انداز سے چلائی جا رہی تھی اور جن لوگوں کے ہاتھوں چل رہی تھی اُس سے ایک قومی ریاست کا قیام تو ممکن تھا لیکن اس سے آگے کی مہم یعنی اس کو اسلامی ریاست میں تبدیل کرنا، جس کی آرزو میں مسلمان من حیث القوم

اس تحریک میں شامل ہوئے تھے اس تحریک اور ان لیڈروں اور کارکنوں کے بس کا کام نہ تھا۔

ہماری ملّی زندگی میں یہ وہ خلا تھے جنہیں پُر کرنا ازبس ضروری تھا۔ اگر انہیں پُر کرنے کے لیے کوئی متوازی اسلامی تحریک نہ اٹھائی جاتی تو آج اس برعظیم میں مسلمان شدید مایوسی کا شکار ہوتے۔ اس وقت جبکہ پروپیگنڈا کا طوفان ہر طرف سے اٹھایا جا رہا ہے ممکن ہے عوام اس کی افادیت کو پوری طرح نہ سمجھ سکیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ لوگوں کے اندر اس امر کا شعور پیدا ہوگا کہ اس تحریک نے مسلمانوں کو کتنا زبردست سہارا دیا ہے۔

آپ خود سوچیے، کیا تقسیم کے بعد مسلم لیگ ہندوستانی مسلمانوں کی پناہ گاہ بن سکتی تھی؟ اور کیا وہ بن سکی؟ یہ اسی دوسری متوازی تحریک ہی کا اعجاز ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمان اس حقیقت کو جان کر کہ ان کی طاقت کا مدار تعداد پر نہیں بلکہ اُن لاثانی اصولوں پر ہے جن کی وجہ سے انہیں "امتِ وسط" کہا گیا ہے، اُس سرزمین میں اپنی اسلامی انفرادیت کو بچانے اور اسلام کی شمع روشن رکھنے میں پوری طرح مصروفِ عمل ہیں۔ یہ تحریک اگر اس آڑے وقت میں انہیں رجوع الی اللہ کے لیے آمادہ نہ کرتی تو وہ لوگ بالکل ہمت ہار چکے تھے۔ ذرا ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جمعیت علمائے ہند اور مسلم لیگ دونوں وہاں کے مسلمانوں کے لیے بے کار ثابت ہوئی ہیں۔

پھر ذرا اس بات پر بھی غور کیجیے کہ اگر مسلم لیگ تقسیم ملک کے لیے اپنا پورا زور لگا دینے کے بعد بھی خدانخواستہ اس کوشش میں ناکام ہو جاتی تو ان حالات میں کیا وہ مسلمان قوم کے احساسِ شکست کا کوئی مداوا کر سکتی تھی؟ کیا دنیا میں کوئی مثال اس کی موجود ہے کہ ایک جماعت لڑ کر ہار جانے کے بعد پھر کھڑی رہ سکے؟ اس حالت میں کیا احتیاط کا تقاضا یہ نہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک دوسرا خطِ مدافعت (SECOND LINE OF ACTION) اور ایک محفوظ طاقت (RESERVE FORCE) ایسی مہیّا رہے جو آگے کی صفوں کے شکست کھا جانے کی صورت میں قوم کو سنبھالنے کے قابل ہو؟ آج آپ فتح حاصل ہو جانے کے ۱۶ سال بعد باتیں بنا رہے ہیں۔ مگر ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان جو حالات تھے انہیں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ۱۹۴۷ء کے ابتدائی دَور تک ملک کا تقسیم ہو جانا یقینی نہ تھا اور ناکامی کے امکانات خارج از بحث نہ ہو سکتے تھے۔

اُس وقت جس شخص نے پانچ چھ سو مخلص کارکنوں کا ایک مختصر سا گروہ اس غرض کے لیے منظم کیا کہ اگر خدانخواستہ اس جنگ میں مسلم لیگ ناکام ہوگئی تو یہ گروہ مسلمانوں کو سنبھالنے کی خدمت انجام دے سکے، اور اس گروہ کو جنگ سے الگ رکھا تاکہ اس کے لیے کام کرنا ممکن ہو، کیا اس نے یہ اپنی قوم کے ساتھ کوئی برائی کی تھی؟ یہ دُور اندیشی مذمت کی مستحق ہے یا اعتراف کی؟

پھر مسلم لیگ نے تقسیم ملک کا مرحلہ تو بلاشبہ طے کر لیا اور اس کی کامیابی اسی کی کوششوں کی رہینِ منت ہے، ہم اس حقیقت کو پوری طرح تسلیم کرتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا لیگ پاکستان میں مسلم قوم کی اُن آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کے لیے بھی کچھ کر سکی جن کی خاطر ہی اس قوم نے خاک و خون کے سمندر میں سے گزرنا گوارا کیا تھا؟ راجہ محمود آباد کی قماش کے لوگ آج جو چاہیں کہتے رہیں، لیکن یہ حقیقت سورج سے زیادہ روشن اور دن کے اُجالے سے زیادہ واضح ہے کہ ہندی مسلمانوں نے ایک الگ خطۂ ارضی کا مطالبہ صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ خواہ زندہ رہیں یا مریں لیکن یہاں ایک اسلام کی تجربہ گاہ ضرور قائم ہو جائے۔ آپ خود ہی غور کیجیے کہ اس نصب العین کی بے حرمتی میں جو ہاتھ شامل ہیں اُن میں کتنی تعداد اُن ہاتھوں کی ہے جنہوں نے کبھی مسلم لیگ کے پرچم کو سنبھال رکھا تھا اور جن کی قیادت میں کبھی "پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ" کے فلک شگاف نعرے لگا کرتے تھے۔ یہ درحقیقت کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ تقسیم سے برسوں پہلے اس کے آثار نظر آ رہے تھے اور کوئی دُور اندیش آدمی یہ دیکھ رہا تھا کہ ان ہاتھوں سے جو ریاست قائم ہوگی اس میں اسلام کے متعلق ان وعدوں کا کیا حشر ہوگا۔ اس نے آگے کے ان حالات کا محض پیشگی اندازہ ہی نہیں کیا بلکہ صاف صاف لکھ بھی دیا کہ ان کی بنائی ہوئی ریاست کے رنگ ڈھنگ کیا ہونگے، اور آج ہر ایماندار آدمی دیکھ سکتا ہے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ لفظ بلفظ صحیح ثابت ہوا۔ اب اگر اُسی دُور اندیش انسان نے یہ وقت آنے سے برسوں پہلے ایک تربیت یافتہ منظم جماعت اس غرض کے لیے تیار کرنی شروع کر دی کہ اسلام سے جب یہ فرار ہونے لگے تو وہ جماعت غلط کار ہاتھوں کو روکنے کے قابل ہو تو کیا اس نے اپنی قوم اور اپنے دین کے ساتھ یہ کوئی بے وفائی کی تھی؟ اس کے اس کام پر اُن لوگوں کا غصہ تو سمجھ میں آ سکتا ہے جن کی غلط کاریوں کے راستہ میں یہ شخص اور جماعت مزاحم ہے؟ مگر کیا اس خدمت پر وہ

مسلمان قوم کی ناراضی کے بھی مستحق ہیں؟

جو لوگ آج مولانا مودودی پر پاکستان دشمنی کے الزامات لگا رہے ہیں وہ خود آج سے چند سال پیشتر پاکستان کے کتنے حامی اور خیر خواہ تھے اور انہیں ملت کا کتنا درد تھا، اور اس کی خدمت کے لیے انہوں نے کتنی قربانیاں دیں، اُن کا حال پوری قوم جانتی ہے، اس لیے ہم اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے۔ البتہ اس امر کی وضاحت کے لیے کہ بیس بیس پچیس پچیس سال پہلے کی تحریروں کو ان کے تاریخی پس منظر اور اس زمانے کے حالات سے قطع نظر کر کے کھنگالنا کس قدر غلط ہے، ہم اسی دور کی تاریخ کا ایک اور باب بھی سامنے لا کر رکھتے ہیں تاکہ ہر معقول آدمی سمجھ سکے کہ پرانی چیزوں سے اُلٹے سیدھے نتائج نکالنے پر اگر کوئی اُتر آئے تو کس کا دامن بچا رہ جائے گا۔ یہ باب ہماری ملت کی دو نہایت محترم شخصیتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ دونوں بزرگ ہر طبقے میں انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی خدمات اور بے لوثی کا سب کو اعتراف ہے۔ اُن کے بارے میں کچھ عرض کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم خدانخواستہ اُن کی تذلیل کرنا چاہتے ہیں، بلکہ ہمیں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک دور کے حالات دو مخلص اصحابِ فکر کو کس طرح دو مختلف نتائج تک لے جاتے ہیں اور وہ شخص کیسی سخت غلطی کرے گا جو حالات کے پس منظر کو اور ان اصحاب کے نقطۂ نظر کو سمجھے بغیر اُن میں سے کسی ایک کو برسرِ غلط ٹھیرانے اور کسی کے اخلاص پر شبہ کرنے کی جسارت کرے۔

ان شخصیتوں میں سے پہلی شخصیت ڈاکٹر سر محمد اقبال کی ہے۔ مسلم لیگ اور قائداعظم سے انہیں جو قلبی لگاؤ تھا اُس کے بارے میں کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں لیکن یہ امرِ واقعہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب ڈاکٹر صاحب نے لیگ اور قائداعظم دونوں کی مخالفت کی۔ مسلم لیگ کے سرگرم کارکن اور ڈاکٹر اقبال کے دیرینہ نیاز مند ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب "اقبال کے آخری دو سال" میں اس کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے:

"تحریکِ عدم تعاون کے زوال کے بعد جب آل انڈیا مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا، اور اس دور کا پہلا اجلاس مئی ۱۹۲۴ء میں لاہور کے گلوب تھیٹر میں منعقد ہوا تو ڈاکٹر صاحب کے مکان واقع میکلوڈ روڈ اور گلوب تھیٹر کی دیواریں ساتھ ساتھ تھیں۔ لیکن اس قربِ مکانی کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے مسلم لیگ کے جلسے میں قدم رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب مسلم لیگ کے دو حصے ہو گئے تو ڈاکٹر صاحب جناح لیگ کے مخالف اور شفیع لیگ کے حامی تھے۔ یہاں تک کہ وہ شفیع لیگ کے سکرٹری بھی بن گئے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں جب مسلم لیگ کا زور توڑنے کے لیے آل انڈیا مسلم کانفرنس معرضِ وجود میں آئی تو ڈاکٹر صاحب اس کانفرنس کے بڑے سرگرم رکن تھے۔ پہلے وہ اس کی مجلسِ عاملہ کے ممبر اور پھر اس کے صدر بن گئے تھے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو جو راقم التحریر کے دیرینہ کرم فرما اور دوست ہیں ۲۸-۱۹۲۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سکرٹری اور مسٹر جناح کے دستِ راست تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ: "جب دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کی آل انڈیا کنونشن نے ان تینوں ترمیموں کو بیدردی سے رد کر دیا جو مسٹر جناح نے پیش کی تھیں تو مسلم لیگ کی حالت سخت نازک ہو گئی مسلمانوں کا سوادِ اعظم مسلم کانفرنس کی قیادت میں آچکا تھا۔ اُدھر کانگریس نے یوں ہمارا دستِ تعاون جھٹک دیا۔ ان حالات میں میں ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں لاہور حاضر ہوا تاکہ مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناح کے رویے پر سخت نکتہ چینی کی اور فرمایا کہ مسلمانوں کی سیاست میں مسٹر جناح نے جو الجھن پیدا کر دی ہے جب تک وہ اس پر ندامت کا اظہار کر کے آئندہ اس سے کلیتہً مجتنب رہنے کا وعدہ نہ کریں مصالحت نہیں ہو سکتی۔" (ص ۳۰۸-۳۰۹)

اب ذرا سوچیے کہ آج اگر کوئی شخص صرف اس اقتباس کو سامنے رکھ کر یہ کہنا شروع کر دے کہ ڈاکٹر اقبال مسلم ملت کے بدخواہ اور قائدِ اعظم کے مخالف تھے، یا قائدِ اعظم نے کسی وقت مسلم ملت کو

(باقی ص ۲۰۷ پر)

(بقیہ اشارات)

نقصان پہنچایا تھا تو کیا وہ حق کا خون نہ کرے گا؟

قائداعظم محمد علی جناح کو پاکستان سے قلبی غیر معمولی محبت ہو سکتی تھی کیا اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے؟ وہ اس تحریک کے سب سے بڑے علمبردار تھے اور انہیں کی قیادت اور سربراہی میں یہ تحریک کامیاب ہوئی۔ لیکن اس امر سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ۱۹۴۰ء سے پہلے تک وہ تقسیم ملک کے تخیّل کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور انہوں نے بدرجۂ آخر اس نصب العین کو ابنائے وطن کی مسلسل عیّاریوں سے مجبور ہو کر اپنایا۔ اپنی سیاسی زندگی کے آغاز میں وہ سالہا سال تک کانگرس کے ہم نوا رہے۔ پھر اس سے الگ ہونے کے بعد بھی اس جماعت کی احسان فراموشی، تنگ دلی اور ہندوانہ ذہنیت کو جاننے کے باوجود مدّتوں اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ مسلمانوں کے لیے چند تحفظات منظور ہو جائیں تو وہ دل وجان سے کانگرس کے ساتھ مل کر آزادئ وطن کا متحدہ محاذ قائم کریں حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ مخلوط انتخاب تک کو بعض شرائط کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے تاکہ کسی نہ کسی طرح کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ ہو جائے اور آزادئ ہند کے لیے اس سے مل کر جدوجہد کی جا سکے۔ ۷ر فروری ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے ارشاد فرمایا تھا:

> "میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہمارے ساتھ بھی اس رواداری اور اسی مصالحت کا سلوک کیجیے۔ ہمارا ہاتھ حاضر ہے۔ یہ دوستی اور اخوت کا ہاتھ ہے آپ بھی اپنا ہاتھ بڑھائیے ہم اتحاد کے لیے بالکل تیار ہیں۔" (اقبال کے آخری دو سال ص ۴۴۱)

قائداعظم کی ہندو مسلم اتحاد کے لیے یہ زبردست خواہش ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر حکومت مغربی پاکستان کے ایک وزیر جناب عبدالوحید خاں صاحب نے اپنی کتاب "تقسیم ہند" میں اس امر کی پوری وضاحت فرمائی ہے۔ یہاں ہم اس کے چند اقتباسات

پیش کرتے ہیں:

"مسٹر جناح مسلم لیگ کے ذریعے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ضرور چاہتے تھے لیکن وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے اس دورِ انتشار میں بھی کوشاں رہے۔ وہ فرقہ وارانہ اختلافات کے خلاف تھے اور جداگانہ انتخاب کو بھی ایک عارضی اور عبوری علاج سمجھتے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں وہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی ممبری سے رولٹ بل کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استعفا دے چکے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے انڈین ریفارم بل کے سلسلے میں پارلیمنٹ کی مقرر کردہ جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے اپنے ایک مفصل اور مدلل بیان میں اس امر کی شہادت دی تھی[1] کہ:

"میں مسلمانوں کے لیے کسی خاص رعایت کا خواہشمند نہیں ہوں بلکہ مجھ سے زیادہ کوئی آدمی اس وقت خوش نہ ہوگا جب وہ دن آئے کہ ہندو مسلم حقوق کے امتیاز کو بالکل ختم کر دیا جائے اور مسلمانوں کی علیحدہ نمائندگی کا سوال ختم ہو جائے"

(پارٹیشن آف انڈیا از بی۔ آر امبیدکر صفحہ ۳۰۹)

"گول میز کانفرس میں مسٹر جناح نے آخر وقت تک لیگ اور کانگرس سمجھوتے کی کوشش کی مگر ناکام ہوئے۔ مسلمان بجائے پچیس فی صد کے اپنے لیے ۳۳ فیصدی تناسب مرکزی اسمبلی میں چاہتے تھے مگر کانگرسی لیڈروں نے ہندو مہاسبھا کے لیڈروں کو سامنے لا کر ان کی آڑ لی اور مسلمانوں کا کوئی مطالبہ نہیں مانا۔"

کانگرس کی ان تمام بے اعتنائیوں کے باوجود مسلم لیگ نے پھر ۱۹۳۶-۳۷ء کے عام انتخابات میں کانگرس کے ساتھ پورا اشتراک کیا لیکن جیسے ہی کانگرس انتخابات میں کامیاب ہو گئی اس نے پھر مسلم لیگ کے اتحاد کی پیش کش کو مسترد کر دیا۔

اس دور میں بھی جبکہ حسرت موہانی، ظفر علی خاں اور علی برادران کانگرس سے مایوس ہو چکے تھے اور نہرو رپورٹ اور گول میز کانفرس کے بعد تمام امیدیں منقطع کر چکے تھے، مسٹر جناح، گاندھی اور

---

[1] صفحہ ۱۰۱

جواہر لال سے صلح کی اُمید لگائے رہے اور جیسے ہی جواہر لال نہرو نے متکبرانہ انداز میں مسلم لیگ کا دوستی کا ہاتھ جھٹک دیا تو انہوں نے مہاتما گاندھی سے اپیل کی کہ وہ مداخلت کر کے دونوں پارٹیوں میں صلح کرا دیں۔ لیکن گاندھی جی نے اپنی معذوری ظاہر کر دی۔"

(تقسیم ہند ص ۱۰۳، ۱۰۴)

یہی نہیں بلکہ قائداعظم نے تقسیم ملک سے تھوڑی مدت پہلے تک اپنی طرف سے اس امر کی پوری کوشش کی کہ کسی طرح کانگرس کے ساتھ اُن کا سمجھوتہ ہو جائے، اور اس کوشش میں وہ یہاں تک گئے کہ انہوں نے کیبنٹ مشن پلان قبول کر لیا تھا، حالانکہ اس وقت وہ خود بھی اور ہندوستان کے قریب قریب سارے ہی مسلمان کانگرس کے معاندانہ رویہ سے سخت مایوس تھے۔ اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جناب عبدالوحید خاں صاحب فرماتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم لیگ کا ایک زبردست عنصر مسلم لیگ کونسل کے اس فیصلے پر مایوس تھا جس میں کیبنٹ مشن پلان منظور کیا گیا تھا۔ لیکن کیونکہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے دوسرے لیڈروں کی یہ خواہش تھی کہ اس لویل اور پریشان کن مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کیا جائے اور کانگرس کے لیڈروں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا جائے اس لیے انہوں نے پلان کو منظور کرنا مناسب سمجھا۔ کونسل نے اُن کے مشورہ کو قبول کیا اور ان لوگوں کو جو ہندوستان کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے حصولِ آزادی کے حق میں تھے ایک موقع دیا۔ اگرچہ اس سے کانگرس کی تنگ نظری اور ضد کی بنا پر کچھ فائدہ نہ اٹھایا جا سکا . . . . مسٹر جناح کے اس اصرار کے باوجود کہ لیگ کا فیصلہ کونسل کا فیصلہ تھا فطری طور سے اور صحیح طور سے یہ سمجھا گیا کہ یہ اسی کا فیصلہ تھا۔ جس طرح گزشتہ مہینے میں شملہ میں اُس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک تعمیری اور اثباتی اقدام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اسی طرح اس فیصلے سے انہوں نے پھر ایک مرتبہ اپنے نکتہ چینوں کو حیرت میں ڈال دیا جو اُن کے خلاف یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ ہر اُس تجویز کو جو اس کی ایک مبہم اور غیر واضح اور ناقابلِ عمل پاکستان کے نقطۂ نظر سے کم ہو مسترد

کر دیتے ہیں اور اس طرح وہ آئینی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ شملہ کی طرح انہوں نے یہاں بھی اسی اصول پر عمل کیا تھا کہ اپنے بنیادی عقیدے کو چھوڑے بغیر مخالف نقطۂ نظر کی رعایت ملحوظ رکھی جائے۔ ان کے مخالفین نے بلاشبہ ان ابہامات اور چھپے ہوئے نکتوں کی طرف اشارہ کیا جو مسلم لیگ کے ریزولیوشن میں موجود تھے اور پوچھا کہ آیا ان سب کا مجموعی اثر اسکیم کی منظوری کو دراصل کالعدم کر دینے کے لیے کافی ہے یا نہیں لیکن کچھ قدامت پرست مسلمان ایسے بھی تھے جن کے لیے یہ تحفظ حد سے زیادہ مصالحت آمیز تھی۔ کلکتہ کے مارننگ نیوز نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا:

"یا تو یہ نعرہ تھا کہ پاکستان یا موت اور اب نہ ہی پاکستان ہے اور نہ موت بلکہ اوّل الذکر کی تبدیلی اور موخر الذکر کی تیاری۔" (ص ۲۴۵ تا ۲۴۷)

قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی کے بارے میں حکومتِ مغربی پاکستان کے ایک وزیر باتدبیر کی یہ توضیحات گہرے غور و فکر کی محتاج ہیں۔ یہ اقتباسات کافی طویل ہو گئے ہیں لیکن ہم نے انہیں یہاں اس لیے نقل کیا ہے تاکہ ناظرین کو یہ معلوم ہو جائے کہ جس اصول کے تحت آج مولانا مودودی کو ملک و ملت کا دشمن قرار دیا جا رہا ہے اس کی اثر آفرینیوں سے تو کوئی محترم سے محترم ہستی بھی نہیں بچ سکتی۔ آپ اگر کسی رہنما کے نظریات میں وقت کے حالات اور تاریخی پس منظر اور ارتقاء کے فطری عمل کو نظر انداز کر کے سلسلے کی صرف ایک کڑی کو لیکر کوئی فیصلہ کر ڈالتے ہیں تو یہ اُس کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔ مسٹر جناح کی پاکستان دوستی کے بارے میں کسے کلام ہو سکتا ہے لیکن آج اگر کوئی شخص مرحوم کی ۱۹۱۶ء کی کسی تقریر کی بنیاد پر یہ کہنا شروع کر دے کہ وہ متحدہ ہندوستان کے علمبردار تھے تو یہ سخت ناانصافی ہو گی۔

ان کے فکری ارتقاء کی معقول توجیہ یہی کی جا سکتی ہے کہ قائداعظم ایک انصاف پسند خادمِ ملت تھے۔ ملت کو فلاح و کامرانی کی منزل تک پہنچانے کے لیے انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف تدابیر اختیار کیں۔ اس مقصد کے لیے کبھی انہوں نے حالات کے پیشِ نظر ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشش کی اور کبھی مسلم قوم کے لیے ایک آزاد خطۂ ارضی کا مطالبہ کیا۔ اس کشمکش میں انہیں مختلف مراحل میں سے گزرنا پڑا اور ہر مرحلہ پر انہوں نے ملک

قوم کے مجموعی مفاد کو سامنے رکھ کر مختلف فیصلے کیے مختلف اوقات میں ان فیصلوں کے اندر کافی اختلاف بھی رہا لیکن ان سب کے پیچھے ایک مقصد اور جذبہ کارفرما تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق حاصل ہو سکیں۔

یہ کوئی ادق فلسفہ نہیں جس کو سمجھنے کے لیے کسی گہری سوچ کی ضرورت ہو۔ یہ ایک آسان اور سادہ سی حقیقت ہے جس سے ہم پوری طرح آشنا ہیں اور اسی کے مطابق مصلحین کے کارناموں کا جائزہ لیتے ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا جذبہ ہے جس کے تحت مولانا مودودی کی ملی خدمات کو جانچتے ہوئے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مصلحین اور رہنمایانِ قوم کی حیثیت اطبا کی سی ہوتی ہے۔ جس طرح ایک طبیب ایک مریض کے مزاج اور دیگر احوال کو سامنے رکھ کر مختلف اوقات میں اس کے لیے مختلف دوائیں تجویز کرتا ہے بالکل اسی طرح قوم کے خادم بھی اُس کے احوال کے مطابق اصلاحِ حال کی کوششوں میں تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں۔ اس تبدیلی کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی تہ میں مریض کو مار ڈالنے کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ اسی طرح ایک ہی مریض کے لیے بسا اوقات دو مختلف طبیب مختلف علاج تجویز کرتے ہیں اور مریض بیک وقت ایک ہی طبیب سے علاج کرا سکتا ہے۔ اب اگر ایک طبیب کے علاج سے مریض کو ایک حد تک افاقہ ہو جائے تو کوئی عقلمند یہ نہیں کہہ سکتا کہ دوسرا طبیب اس مریض کا دشمن تھا اور آئندہ وہ کبھی اس مریض کے قریب نہ پھٹکنے پائے۔ اس طرح کی باتیں یا تو احمق لوگ کیا کرتے ہیں یا پھر وہ پیشہ ور لوگ جو اپنی پریکٹس کی اجارہ داری چاہتے ہوں، اور جن کے پیشِ نظر یہ بات ہو کہ مریض چاہے جیئے یا مرے مگر ان کے مطب سے باہر نہ جانے پائے۔

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا